شیخ زرقا لکھتے ہیں،

"عرف لفظی یہ ہے کہ بعض الفاظ یا تراکیب لوگوں کے درمیان کسی مخصوص معنی میں استعمال ہونے لگیں اس طرح کہ جب بھی وہ لفظ استعمال کیا جائے قرینہ اور عقلی رشتہ کے بغیر ذہن اسی مخصوص معنی کی طرف منتقل ہو جائے [۲۳]"

اگر اس مخصوص معنی کے مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ یا عقلی مناسبت ہے تو اسے عرف لفظی نہیں بلکہ "مجاز" کہیں گے جیسے کوئی کسی سے کہے کہ یہ سامان میں تمہیں دس روپیہ میں "ہبہ" کرتا ہوں، حالانکہ مقصد "ہبہ" نہیں بلکہ بیچنا ہے اور روپیہ کا تذکرہ اس کے لیے قرینہ ہے کہ "ہبہ" کا لفظ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ ایک مخصوص معنی مراد ہے۔ ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ "عدالت نے فیصلہ کیا ہے" حالانکہ عدالت فیصلہ نہیں کرتی بلکہ قاضی فیصلہ کرتا ہے لوگ اس لفظ سے سمجھتے بھی یہی ہیں کیونکہ عدالت تو جگہ کا نام ہے اس کے اندر فیصلہ کی صلاحیت نہیں مگر ایک گونہ مناسبت کی وجہ سے مجازاً ایسا کہہ دیا جاتا ہے ان دونوں مثالوں میں لفظ ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے مگر اس کی وجہ عرف وعادت نہیں بلکہ قرینہ اور عقلی مناسبت ہے۔ عرف لفظی کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ لفظ "دابّہ" باعتبار لغت ہر قسم کے جانوروں کو شامل ہے مگر بعض علاقوں میں صرف گھوڑے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ لفظ "لحم" (گوشت) لغت کی رو سے مچھلی پر بھی بولا جا سکتا ہے خود قرآن نے مچھلی کے لیے اسے استعمال کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ	وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر
الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا	کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے ترو
طَرِيًّا (نحل ۱۴)	تازہ گوشت لے کر کھاؤ۔

مگر عرف میں مچھلی کے گوشت پر "لحم" کا اطلاق نہیں ہوتا ہے لہٰذا اگر کسی کو بازار گوشت لانے بھیجا جائے اور وہ مچھلی اٹھا لائے تو اسے تعمیل حکم کرنے والا نہیں سمجھا جائے گا۔

۳۔ "ولد" لغت کے اعتبار سے مذکر و مونث دونوں کو شامل ہے خود قرآن نے اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ (نساء۔۱۲)

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا۔ اگر وہ بے اولاد ہیں۔

مگر محاورہ اور استعمال کے اعتبار سے یہ لڑکے کے لیے مخصوص ہے، چنانچہ اگر کوئی کسی کے "ولد" کے لیے وقف یا وصیت کرتا ہے تو اس میں لڑکیاں شامل نہ ہوں گی۔[۲۴]

عرف عملی

عرف عملی یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی زندگی یا آپسی معاملات میں کسی چیز کے خوگرد عادی ہو جائیں جیسے کھانا پینا، لباس پہننا وغیرہ یا جیسے نکاح وخرید وفروخت قرض و ادائیگی وغیرہ کے معاملات، فهو اعتبار الناس على شيء من الافعال العادية او المعاملات المدنية۔[۲۵]

علماء اصول عام طور سے عرف لفظی وعملی کی تعریف الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہی کرتے ہیں، لیکن قرافی کی تعبیر تھوڑی سی مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"اہل عرف لفظ کو کسی متعین معنی میں استعمال کریں لیکن وہ معنی لغت میں نہ ہو تو وہ عرف قولی ہے اور عرف عملی یہ ہے کہ لفظ کسی معنی کے لیے بنایا گیا ہو لیکن اہل عرف اس لفظ سے اس کے معنی کی تمام قسموں کو چھوڑ کر کسی خاص قسم کو مراد لیتے ہیں"[۲۶]

عرف کی ایک اور تقسیم بھی کی گئی ہے اور وہ ہے (۱) عرف عام اور (۲) عرف خاص۔

عرفِ عام

عرف عام کی یہ تعریف کی جاتی ہے:

العادة المتعارفة في سائر البلاد تسمى العرف العام[۲۷]

وہ عادت جو تمام شہروں میں متعارف ہو اسے عرف عام کہتے ہیں۔

علامہ زحیلی نے اسے ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

وهو ما يتعارفه غالبة اهل

کسی بھی وقت میں تمام شہروں کے اکثر

البلد ان فی وقت من الاوقات [۲۸]
لوگوں کے درمیان جو چیز متعارف ہو وہ عرف عام ہے۔

عرف عام کی مذکورہ تعریف چونکہ "اس عرف" کو بھی شامل ہے جس پر صحابہؓ نے اعتراض کیا ہو نہ تابعین نے اور نہ کسی عالم دین نے، حالانکہ حقیقت میں یہ عرف نہیں بلکہ "اجماع" کی مکمل ترین شکل ہے اس لیے ابوزہرہ کا خیال ہے کہ عرف عام کی یہ تعریف ہونی چاہیے۔

ان العرف العام ھو الذی یسود فی کل الامصار من غیر نظر الی القرون الغابرۃ [۲۹]
عرف عام وہ ہے جو تمام شہروں میں رائج ہو گذشتہ زمانوں کی طرف نظر کیے بغیر۔

حاصل یہ ہے کہ تمام شہروں کے اکثر لوگوں کے رسم و عادت کا نام عرف عام ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ تمام شہروں سے ایک ملک کے تمام شہر مراد ہیں یا پوری دنیا کے تمام شہر، اس کا جواب حتمی طور سے مجھے نہ مل سکا، خیال ہوتا ہے کہ وہ ممالک جن کا ماحول و معاشرہ یکساں ہے جن کا رہن سہن ایک دوسرے سے ملتا ہے ان کی اکثریت کا رسم و رواج عرف عام کہلائے گا تمام دنیا کے ممالک اس میں شامل نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو پھر عرف عام کا دائرہ بہت سمٹ جائے گا مشکل سے عرف عام کی دو چار مثالیں مل پائیں گی، گویا نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

عرفِ خاص

کسی خاص گروہ، طبقہ یا شہر کا عرف عرف خاص کہلاتا ہے جیسے صنعت کاروں تاجروں وغیرہ کا عرف۔

شیخ زرقا رقم طراز ہیں:

فھو الذی یکون مخصوصا ببلد او مکان دون اخر او بین فئۃ من الناس دون اخری [۳۰]
عرف خاص وہ ہے جو کسی شہر، جگہ یا مخصوص طبقہ کے درمیان رائج ہو دیگر لوگوں میں اس کا رواج نہ ہو۔

عرف کی یہ قسم حد درجہ متنوع ہے کیونکہ لوگوں کی ضروریات، مزاج و ماحول، معاشرہ اور

حالات میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ عرف کی ایک تقسیم صحیح اور فاسد کی بھی کی گئی ہے۔

عرف صحیح

عرف صحیح وہ عرف ہے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہو اور کتاب و سنت کے خلاف اور شریعت کے مزاج و طبعیت کے مغائر نہ ہو۔ شیخ عبدالوہاب خلاف لکھتے ہیں:

عرف صحیح وہ ہے جو لوگوں کے درمیان رائج ہو اور کسی شرعی دلیل کے مخالف نہ ہو اور کسی حرام کو حلال اور کسی واجب کو باطل نہ کرے [۳۱]

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہی تعریف زحیلی نے بھی کی ہے [۳۲] لیکن ان میں سب سے زیادہ واضح اور جامع تعریف ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی ہے وہ لکھتے ہیں:

ما لا یخالف نصا من النصوص الشرعیہ ولا قاعدۃ من قواعدھا وان لم یرد بہ نص خاص [۳۳]	عرف صحیح وہ ہے جو شریعت کے کسی نص اور قاعدہ کے خلاف نہ ہو اگرچہ اس کے متعلق کوئی خاص نص موجود نہ ہو

عرف فاسد

وہ عرف جو کتاب و سنت سے متصادم ہو جس کی وجہ سے محرمات کا دروازہ کھل جاتا اور شرعی حدود ٹوٹ جاتے ہوں وہ عرف فاسد کہلاتا ہے [۳۴] جیسے شراب نوشی، سود خواری کا رواج، رشوت کی گرم بازاری، جنسی انارکی، نفسانی خواہشات کی پیروی، یہ عرف مردود ہے، کیوں کہ اسے معتبر ماننے میں شریعت کی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔

عرف کے قانون شرعی ہونے کے دلائل

قرآن:

عرف کی حجیت کے سلسلہ میں عام طور سے قرآن پاک کی اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے:

خذ العفو وامر بالعرف واعرض	معافی کو اختیار کرو، بھلائی کا حکم دو اور

عن الجاهلين — جاہلوں سے اعراض کرو۔

نیز بعض لوگوں نے قرآن کی اس آیت کو بھی بطور استدلال پیش کیا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ	جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ
مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى	ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا اور کسی
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ	روش پر چلے درآں حالے کہ اس
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ	پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو تو اس کو
(النساء: ۱۱۵)	ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود
	پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے۔

استدلال یہ ہے کہ مومن ومسلم کے طریقے کے علاوہ کسی اور راستے کے اختیار کرنے پر وعید سنائی گئی ہے گویا "سبیل مومن" کی اتباع واجب ہے اور مومن کا راستہ وہی ہے جسے وہ زندگی کی روش میں اچھا اور بہتر خیال کرتا ہے[۴۵]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں فقہاء کے اصطلاحی عرف سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ عرف سے مراد یہاں:

وہ چیز ہے جسے خود شریعت نے اچھا اور پسندیدہ قرار دیا ہو، رہی وہ چیز جسے لوگوں نے اپنی فکر ونظر اور خیال کے مطابق اچھا سمجھا ہو وہ مقصود نہیں ہے۔ نیز دوسری آیت بھی عرف سے متعلق نہیں ہے کیوں کہ عرفی احکام پر عمل کرنا صرف جائز ہے واجب نہیں جبکہ اس آیت سے وجوب معلوم ہوتا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے سے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے لہٰذا یہ ایک اجماع کے لیے دلیل تو بن سکتی ہے مگر عرف کے لیے نہیں البتہ عرف کی حجیت کے سلسلہ میں قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے ارشاد ربانی ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ	اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف
وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ: ۲۳۳)	طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔

اس آیت میں "معروف" سے مراد وہی نان نفقہ اور کپڑا ہے جو معاشرہ اور سوسائٹی میں رائج ہو۔

حدیث :

عرف کی حجیت کی سب سے اہم دلیل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ہے کہ آپ نے بہت سے اسلامی احکام کی بنیاد عرف وعادت پر رکھی ہے۔ چنانچہ عربوں کے رواج کے مطابق خونبہا کا ذمہ دار خاندان والوں اور ہم پیشہ افراد (عاقلہ) کو قرار دیا، خرید وفروخت[۳۵] کے طریقوں سے لے کر نکاح تک میں مسئلہ کفائت کی بنیاد عرف ورواج پر رہی ہے[۳۷]۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے:

ما راٰہ المسلمون حسنا	جسے مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ اللہ کے
فھو عند اللہ حسن وما راٰہ	یہاں بھی اچھا ہے اور جسے مسلمان قبیح
المومنون قبیحا فھو عند اللہ قبیح[۳۸]	اور برا سمجھیں تو وہ اللہ کے یہاں بھی برا ہے۔

یہ گو ایک صحابی کی اپنی رائے اور اپنا خیال ہے لیکن چونکہ اس طرح کی بات قیاس اور رائے سے نہیں کہی جاسکتی ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی کہا ہو۔ وانہ ان کان موقوفاً علیہ فلہ حکم المرفوع لانہ لامدخل فیہ للرای[۳۹] حضرت عبداللہ ابن مسعود کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ عرف عام میں جس چیز کو اچھا خیال کیا جاتا ہے وہ بلاشبہ "حسن" ہے۔ یہ صرف ایک صحابی کی رائے نہیں بلکہ تمام صحابہ کرام کا یہی طرز عمل رہا ہے۔

استصناع :

(یعنی آرڈر دے کر کوئی چیز بنوانا) ایک غیر موجود کی فروختگی ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر موجود شی کی فروخت سے منع فرمایا ہے۔ مگر تمام صحابہ کرام نے اجماعی طور پر عرف ورواج کی بنا پر اسے جائز قرار دیا ہے اور سمجھا کہ حدیث اس خاص معاملہ کو شامل نہیں ہے کیونکہ عرف عام کی مخالفت میں حرج ودشواری پائی جاتی ہے اور لوگوں کو تنگی اور دشواری میں مبتلا کرنا شریعت کی روح اور مقصد کے خلاف ہے ارشاد ربانی ہے۔

ما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج۔ ۷۸) اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی

اجماع :

عرف کی حجیت کے سلسلہ میں فی الجملہ تمام مکتبہ فکر کے لوگوں کا اتفاق ہے اور

ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے، اس سے متعلق تمام فقہاء کی رائے کا نقل کرنا باعث طوالت ہے یہاں ہر مکتب فقہ کے ایک ایک عالم کی رائے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

فقہ حنفی کے ترجمان علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"بہت سے احکام زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے بدل جایا کرتے ہیں کیونکہ لوگوں کا عرف بدل جاتا ہے نئی ضرورت پیش آجاتی ہے، بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ان سب کے باوجود بھی پہلے حکم ہی کو باقی رکھا جائے تو لوگ تنگی و مشقت میں مبتلا ہو جائیں اور یہ بات شریعت کے اصول کے خلاف ہے جس کی بنیاد آسانی فراہم کرنے اور ضرر اور فساد دور کرنے پر ہے۔"[۴۰]

یہ بات علامہ شامی نے دوسرے مقامات پر بھی کہی ہے[۴۱]

مالکی فقہ کے امام قرافی لکھتے ہیں:

جب بھی نیا عرف سامنے آئے اس کا اعتبار کرو، جب بدل جائے تو اسے چھوڑ دو، ہمیشہ محض کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں پر جمے نہ رہو۔ بلکہ تمہارے پاس اگر کسی دوسرے ملک کا آدمی فتویٰ پوچھنے آئے تو اسے اپنے عرف کے مطابق مسئلہ نہ بتاؤ بلکہ اس کے یہاں کے عرف کے بارے میں معلوم کرو اور اسی کے مطابق جواب دو، صحیح اور حق یہی ہے ہمیشہ منقولات پر جمے رہنا، گمراہی، علماء مسلمین کے مقاصد سے ناواقفیت اور سلف کے طریقے کے خلاف ہے۔[۴۲]

شوافع بھی عرف کو کم اہمیت نہیں دیتے چنانچہ امام سیوطی لکھتے ہیں:

"جان لو کہ فقہ میں عرف وعادت پر مبنی مسائل بے شمار ہیں۔"[۴۳]

علامہ ابن قیم حنبلی نے اس موضوع پر ایک خاص فصل (عنوان) کے تحت بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ فصل زمان ومکان حالات، نیتوں اور عادتوں کے بدل جانے کی وجہ سے فتویٰ کی تبدیلی کے بیان میں ہے۔

یہ فصل بہت ہی عظیم النفع ہے کہ اس کے نہ جاننے کی وجہ سے شریعت کے سلسلے میں کافی غلطیاں رونما ہوتی ہیں اور جس کی وجہ سے لوگ ایسی مشقت اور پریشانی اور مشکل میں پڑ گئے جس کی کوئی بنیاد نہ تھی، اس سے

معلوم ہوگا کہ روشن شریعت جس میں اعلیٰ درجہ کی مصلحتیں ہیں ایسا حکم کبھی نہیں دے سکتی، کیونکہ شریعت کی بنیاد ہی حکمت و مصلحت پر ہے اس کے پیش نظر دنیا و آخرت دونوں جگہوں کی مصلحتیں ہیں یہ مکمل عدل ہے، رحمت ہے، سراپا حکمت و مصلحت ہے، ہر وہ مسئلہ جس میں عدل کے بجائے ظلم ہو، رحمت کی جگہ زحمت ہو، اچھائی نہ ہو بگاڑ ہو، حکمت نہ ہو بلکہ بے کاری ہو تو وہ حکم شریعت نہیں ہو سکتا ہے[۶۴]

قیاس:

بہت سے شرعی احکام عرف و عادت سے متعلق ہوا کرتے ہیں، لیکن عادت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس تبدیلی کے باوجود پہلے حکم کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے تو نئے عرف سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے مزید پریشانی ہوگی، حالانکہ شرعی احکام سے مقصود سہولت اور آسانی ہے اس لیے حرج و مشقت اور تنگی و پریشانی سے بچانے کے لیے عقل کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے عرف کو ایک قانونی حیثیت حاصل ہو، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

"یقینی طور پر شریعت نے مصالح کا اعتبار کیا ہے اس حیثیت سے عادت کو معتبر ماننا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اگر عادت کا اعتبار نہ ہو تو اس کی وجہ سے ناقابل برداشت تکلیف ہوگی، حالانکہ یہ ناجائز ہے یا غیر واقع ہے"[۶۵]

عرف کے معتبر ہونے کی شرطیں

ایسا نہیں کہ ہر وہ چیز جو رواج پذیر ہو جائے شریعت اسے قبول کرلے۔ جس چیز کو بھی لوگ کرنے لگیں مذہب اسے سند جواز دیدے خواہ اس کے لیے اصولوں کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اگر یہ بات اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں کہی جائے تو قابل قبول ہو سکتی ہے، لیکن اسلام سے یہ توقع رکھنا عبث اور بے کار ہے، اسلام تو آیا ہی ہے اس لیے کہ وہ جاہلیت کے غلط رسم و رواج کو اپنے پیروں تلے روند ڈالے، البتہ صالح عادات کے بارے میں اسلام کا رویہ ہمیشہ ہمدردانہ رہا

ہے، وہ لوگوں کو خواہ مخواہ کی تنگی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا ہے، وہ ان رسم ورواج کو جو اس کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں انھیں فراخ دلی کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے، چنانچہ فقہاء نے شریعت کے مجموعی مزاج ومذاق کو سامنے رکھ کر اس سلسلہ میں چند اصول متعین کیے ہیں، جو بھی عرف اس معیار پر پورا اترے گا اسلام اسے اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے گا، وہ اصول وشرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس وقت معاملہ طے پا رہا ہے یا کوئی حکم دیا جا رہا ہے۔ اس وقت وہ عرف لوگوں میں موجود تھا یا نہیں۔ جو عرف معاملہ طے پا جانے کے بعد قائم ہوا اس کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا ایسے ہی اگر حکم دیتے وقت وہ عرف نہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

لا عبرة بالعرف الطاری[46]   وقتی رواج کا اعتبار نہیں ہے۔

اور امام قرافی کا بیان ہے:

> خرید وفروخت کے بعد ثمن میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، ایسے ہی شرعی نص میں وہی عادت موثر ہے جو نص کے وقت موجود ہو۔[47]

۲۔ عرف کسی نص شرعی یا دلیل قطعی کے خلاف نہ ہو، شریعت کی روح اور اس کے مقاصد سے متصادم نہ ہو۔[48]

۳۔ صراحت عرف کے خلاف نہ ہو[49] مثلاً عرف ہو کہ مزدور آٹھ گھنٹہ کام انجام دیتا ہے مگر معاملہ طے کرتے وقت مزدور نے کہہ دیا کہ وہ صرف چار گھنٹہ کام کرے گا تو اب عرف کے مطابق مزدور کو آٹھ گھنٹہ کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔[50]

امام عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں:

> "جو چیز عرف سے ثابت ہو اگر معاملہ کرنے والوں میں سے کوئی ایک اس کے برخلاف ایسی صراحت کر دے جو عقد کے مقصود کے موافق ہو اور اسے پورا کرنا بھی ممکن ہو تو ایسا کرنا درست ہے۔[51]

۴۔ اکثر لوگ زندگی کے ہر معاملہ میں اس کو ملحوظ رکھتے ہوں ایسا نہ ہو کہ کبھی اس پر عمل کرتے ہوں اور کبھی چھوڑ دیتے ہوں، نیز ایسا نہ ہو کہ اس پر عمل کرنے والے اور نہ کرنے

والے دونوں برابر ہوں۔ جسے اصطلاح میں "عرف مشترک" کہا جاتا ہے۔
ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والعرف المشترك لا يصح الرجوع اليه مع التردد[۵۲]	عرف مشترک پر جس میں کسی ایک جانب رجحان نہ ہو، رجوع کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ شرط عرف عام، خاص، لفظی وعلمی ہر ایک کو شامل ہے۔

عرف اور نص عام میں تعارض

"عرف مقارن" اگر نص عام کے معارض ہو تو اس کے معتبر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں "عرف مقارن" سے مراد وہ عرف ہے جو رسول اللہ ؐ کے عہد مبارک میں موجود ہو جیسے "استصناع" (آرڈر دے کر کوئی چیز بنوانے) میں عرف کا اعتبار کیا گیا۔ حالانکہ یہ معدوم چیز کی فروختگی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز کو بیچنے سے منع کیا ہے جو اپنے پاس نہ ہو۔ لیکن چونکہ استصناع کا رواج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی سے جاری ہے۔ اس لیے مذکورہ عام حدیث کو عرف کی وجہ سے خاص کر لیا گیا۔

عرف عام حادث[۵۳] —— وہ عرف جس کا رواج عہد نبوی کے بعد کسی دور میں ہوا۔ کے معتبر ہونے میں قدرے اختلاف ہے امام رازی فرماتے ہیں۔

اگر "عادت" کی دوسری نوعیت ہے (یعنی جو عہد نبوی میں موجود نہ ہو) تو اس کے ذریعہ نص عام کو خاص کرنا درست نہیں کیونکہ لوگوں کی عادات وافعال شریعت کے خلاف حجت نہیں ہوتے۔[۵۴]

مگر بعض علماء کو اس سے اختلاف ہے ان کا خیال ہے کہ عرف عام اگرچہ حادث ہو پھر بھی اس کے ذریعہ نص میں تخصیص کی جا سکتی ہے چنانچہ ابن عابدین لکھتے ہیں۔

اگر تم کہو کہ آپ نے جو بیان کیا ہے کہ عرف عام نص کے لیے مخصوص بن سکتا ہے اور اس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑا جا سکتا ہے اس سے مراد وہ عرف ہے جو دور صحابہ اور اس کے بعد سے ہی عام ہو کیونکہ فقہاء استصناع کے جواز کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ جائز نہ ہو لیکن اس قیاس کو اس تعامل کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے جس پر نہ صحابہ نے نکیر کی ہے اور نہ تابعین نے یہ ایسی دلیل ہے جس کی وجہ سے

قیاس کو چھوڑا جا سکتا ہے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ فقہاء کی جزئیات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ عرف سے مراد ان کے یہاں اس سے عام ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ساتھ بیچنے اور شرط لگانے سے منع کیا ہے اس کے باوجود فقہاء نے تصریح کی ہے کہ وہ شرط جو متعارف ہو وہ معاملہ خرید و فروخت کے لیے مفسد نہیں۔ مثلاً چمڑا اس شرط پر خریدنا کہ بیچنے والا اسے جوتے کی سائز پر کاٹ دے گا' پرانا موزہ اس شرط پر خریدنا کہ بیچنے والا اسے درست کر کے حوالے کرے ان معاملات کو فقہاء نے عرف کی بنیاد پر ہی درست قرار دیا ہے اور اسی وجہ سے نص میں تخصیص کی ہے۔ [۵۵]

لیکن شیخ زرقاء لکھتے ہیں کہ تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ عرف حادث گو عام ہو نص شریعت کے لیے مخصص نہیں بن سکتا۔

ولا یصلح مخصصًا للنص الشرعي باتفاق الفقهاء، ولو كان عرفا عاما [۵۶]	فقہاء کا اتفاق ہے کہ عرف گرچہ عرف عام ہی کیوں نہ ہو نص شرعی میں تخصیص نہیں کر سکتا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عرف حادث کے ذریعہ نص شرعی کی تخصیص نہیں کی جا سکتی الا یہ کہ وہ نص عرفی ہو یا اس کا دار و مدار کسی علت پر ہو فقہاء کی اصطلاح میں "معلول بعلۃ" ہو۔ خواہ نص کے اندر اس علت کی صراحت ہو یا قیاس و اجتہاد کے ذریعہ علت کو معلوم کیا گیا ہو۔

علامہ ابن عابدین شامی نے عرف حادث کے معتبر ہونے کی جتنی بھی مثالیں پیش کی ہیں وہ سب (معلول بعلۃ) کے قبیل کی ہیں، یعنی اس طرح کے معاملہ سے ممانعت کی ایک خاص وجہ ہے، چونکہ موجودہ عقد میں وہ وجہ نہیں پائی گئی، اس لیے وہ حدیث کے ذیل میں داخل نہیں، چنانچہ شرط متعارف کے ذیل میں اکمل الدین بابرتی رقمطراز ہیں

"یہ نہ کہا جائے کہ عقد کے فاسد ہونے کی وجہ ایک ایسی شرط ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے اور عرف حدیث پر حاکم نہیں ہے اس لیے کہ حدیث میں شرط سے ممانعت کی وجہ باہمی نزاع ہے جس کی وجہ سے عقد کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ حدیث منازعت ختم کرنے کے لیے ہے اور عرف بھی نزاع کو ختم کر دیتا ہے لہٰذا یہ حدیث

کے معنی کے موافق ہے[۵۷]

اس طرح کے معاملہ میں کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ چونکہ یہ عرف حادث عام ہے، اس لیے اس کے ذریعہ سے نص میں تخصیص کر دی گئی، بلکہ وہ تخصیص کی ایک دوسری ہی وجہ بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی شرط کے صحیح ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ عرف عام ہو، بلکہ عرف خاص کے ذریعہ سے بھی ایسی شرطیں لگانا درست ہے۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

اسی طرح ہمارے دیار میں کھڑاؤں اس شرط پر خرید تا ہے کہ بیچنے والا اس میں تسمہ لگا دے[۵۸]

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ حادث ہے اور خاص ہے، کیوں کہ بہت سے ایسے شہر ہیں جہاں قبقاب (کھڑاؤں) پہننے کا تصور بھی نہیں خود ابن عابدین کو اعتراف ہے فرماتے ہیں:

یہ عرف حادث ہے اور خاص بھی ہے، اس لیے کہ بہت سے ایسے شہر ہیں جہاں کھڑاؤں پہننے کا رواج نہیں، حالانکہ صاحب فتح القدیر نے اس رواج کو بھی نص کے بالمقابل معتبر جانا ہے جس میں بیچنے اور شرط لگانے کی ممانعت ہے[۵۹]

اس معاملہ کی اس کے علاوہ اور توجیہ کیا کی جا سکتی ہے کہ ممانعت کی جو علت ہے وہ اس معاملہ میں موجود نہیں ہے یہ کہنا کہ مذکورہ مثال میں عرف خاص حادث کی وجہ سے نص میں تخصیص کر لی گئی ہے ایک بے دلیل بات ہے، خود ابن ہمام نے جس سیاق میں اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے اس کی تردید کے لیے کافی ہے، علاوہ ازیں تخصیص احناف کے یہاں "نسخ" کے حکم میں ہے، کیا کسی عرف کے ذریعہ "نص" کو منسوخ کیا جا سکتا ہے؟ شیخ زرقاء کے الفاظ میں:

اگر بعد میں وجود میں آنے والے مخالف عرف کے ذریعہ نص میں تخصیص جائز ہو تو یہ شرعی حکم کو منسوخ کرنا ہوگا اور ایسا کرنا جائز نہیں کیوں کہ اگر اس طرح تخصیص کی جاتی رہی تو اکثر احکام کی جگہ نئے نئے عرف لے لیں گے اور شریعت بے معنی ہو کر رہ جائے گی[۶۰]

اس پر اتفاق ہے کہ عرف خاص کے ذریعہ خواہ مقارن ہی کیوں نہ ہو ہر نص میں تخصیص پیدا نہیں کی جاسکتی ہے[۱۲۸]

عرف اور نص خاص میں تعارض

اگر لوگ ایسے اعمال کے عادی ہوجائیں جس سے شریعت نے خاص طور سے منع کیا ہو یا شریعت کی منشا کے مطابق اسے ممنوع ہونا چاہیے تو عرف ان کے جواز کے لیے سند نہیں بن سکتا ہے، خواہ عرف عام ہو یا خاص، مقارن ہو، یا حادث، کیونکہ اگر اس صورت میں نص کو چھوڑ کر عرف پر عمل کیا جائے تو شرعی احکام کا مقصد ہی باقی نہیں رہے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"اگر عرف دلیل شرعی کے مخالف ہو، تو اگر مکمل طور سے مخالف ہو کہ اس کی وجہ سے نص کو ترک کرنا پڑے تو اس کے غیر معتبر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، جیسے کہ بہت سی حرام چیزیں، مثلاً سود، شراب وغیرہ کا لوگوں میں متعارف ہونا۔"[۱۲۹]

علامہ شاطبی مزید کچھ تفصیل فراہم کرتے ہیں:۔

رواج پذیر عادتوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ عادتیں جن کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں شریعت نے صراحت کر دی ہے، بایں طور کہ اسے واجب، مستحب، یا حرام و مکروہ کہا ہے اور اس کے کرنے یا نہ کرنے کی تصریح کر دی ہے دوسرے وہ عادت جن کے اثبات و انکار کے لیے کوئی دلیل شرعی موجود نہیں۔

عادت کی پہلی قسم تمام شرعی معاملات کی طرح ہمیشہ برقرار رہے گی، مثلاً غلام کا شہادت کا اہل نہ ہونا اللہ سے مناجات کے لیے طہارت اور ازالہ نجاست کا حکم دینا، ستر کو چھپانا، ننگے ہو کر بیت اللہ کے طواف سے منع کرنا اور اسی طرح کی دوسری عادتیں جو لوگوں میں رائج ہیں، جن کی اچھائی یا برائی کی شریعت نے صراحت کر دی ہے۔ یہ تمام شریعت کے دائرہ کار

کار میں آتے ہیں، لہٰذا اس میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں، اگر اس کے بارے میں فکری رجحان بدل جائے تو بھی ان میں جو چیزیں اچھی ہیں وہ بری نہیں ہوسکتیں، اور جو بری ہیں وہ اچھی نہیں ہوسکتیں، مثلاً یہ کہا جائے کہ اس وقت غلاموں کی گواہی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا ہم اسے جائز کردیں، آج ستر کھولنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اس لیے ہم اسے صحیح کہہ دیں، یا اس طرح کی اور باتیں، اگر اسے درست تسلیم کرلیا جائے تو شریعت کے دائمی اور پائیدار احکام کی منسوخی لازم آئے گی۔[۶۳]

نص عرفی

شریعت میں بہت سے احکام عرف وعادت پر مبنی ہیں، حالات وزمانہ کی رعایت کرتے ہوئے وہ حکم دیا گیا ہے، اگر بعد کے کسی دور میں، احوال وعادات میں تبدیلی واقع ہوجائے تو یقینی طور پر اس تغیر کا اثر "نص عرفی" پر پڑے گا۔ اگر حالات کی تبدیلی کے باوجود پہلے حکم کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے گا تو یہ منشائے شریعت کے خلاف ہوگا، مثال کے طور پر باکرہ عورت کے بارے میں حدیث میں ہے کہ "اذنہا صماتہا" (اس کی خاموشی اجازت ہے) یعنی نکاح کی اجازت لیتے وقت بے شادی شدہ عورت (باکرہ) خاموش رہے تو اس کی خاموشی رضامندی کی دلیل سمجھی جائے گی، کیونکہ "بن بیاہی" عورتیں شرم وحیا کی وجہ سے منہ سے کچھ نہیں بولتیں ان کا نہ بولنا راضی ہونا سمجھا جائے گا، لیکن اگر کسی عہد یا علاقہ میں عورتوں کی اس عادت میں تبدیلی ہوجائے اور وہ اس معاملہ میں اظہار رائے پر کوئی شرمندگی محسوس نہ کریں تو وہاں خاموشی کو دلیل رضامندی نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ وہاں صراحت ضروری ہوگی، کیونکہ مقصد شریعت عورت کی رضامندی ہے اور یہاں صاف لفظوں میں اقرار کرنا کوئی معیوب نہیں ہے، لہٰذا چپ رہ جانا کافی نہیں جیسا کہ شوہر دیدہ عورت کی اجازت کے لیے صراحت ضروری ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ حدیث میں چھ چیزوں کے بارے میں صراحت ہے کہ اضافہ وزیادتی کے ساتھ آپس میں ایک جنس کا دوسرے جنس سے تبادلہ کرنا سود ہے، وہ چھ چیزیں ہیں، سونا، چاندی، گیہوں، جو، نمک، کھجور، اضافہ وزیادتی کا معیار ناپ اور

تول کو قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مذکورہ چھ چیزوں میں سے سونا اور چاندی تول کر بیچے جاتے تھے اور بقیہ چار چیزیں ناپ کر، مگر آج صورت حال یہ ہے کہ مذکورہ تمام چیزیں تول کر بیچی جاتی ہیں، اب اگر کوئی گیہوں کا تبادلہ گیہوں سے کرتا ہے تو کیا وزن کے اعتبار سے برابری ضروری ہے یا پیمانہ کے اعتبار سے؟ خواہ وزن کے اعتبار سے زیادہ ہو جائے۔

امام ابوحنیفہ اور محمد کی رائے ہے کہ آج بھی بقیہ چار چیزوں میں برابری کے لیے ناپ کا اعتبار ہوگا، کیونکہ نص کے معاملہ میں عرف غیر معتبر ہے اس کے برخلاف امام ابویوسف کہتے ہیں کہ عرف پر عمل کرتے ہوئے برابری کا اعتبار کیا جائے گا، اگر عرف تول کر بیچنے کا ہے تو پھر وزن ہی کے اعتبار سے برابری شرط ہے، چونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں آخیر کی چار چیزیں ناپ کر بیچی جاتی تھیں، اس لیے آپؐ نے مساوات کے لیے ان میں ناپ کو معیار قرار دیا، اگر آپؐ کے عہد میں تول کر بیچی جاتیں تو آپؐ تول ہی کو معیار قرار دیتے، جیسا کہ سونا چاندی میں ہے، دوسرے لفظوں میں آپ نے اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق ناپ یا تول کو معیار قرار دیا، چونکہ اب عرف بدل گیا اس لیے بدلے ہوئے عرف کے مطابق عمل کرنا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرنے کے مترادف ہے، عام طور پر فقہاء نے امام ابویوسف کے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے۔ ابن عابدین شامی کا بیان ہے:

> حدیث میں بعض چیزوں کو کیلی (ناپی جانے والی) اور بعض کو وزنی قرار دینے کی علت عرف وعادت ہے، لہٰذا عرف وعادت کا ہی اعتبار ہوگا اور اس کے بدل جانے پر حکم بھی تبدیل ہو جائے گا، اس لیے اس مسئلہ میں بدلے ہوئے عرف کا اعتبار کر لینے میں نص کی مخالفت نہیں، بلکہ اتباع ہے، ابن ہمام نے بظاہر اسی روایت کو ترجیح دی ہے[۱۶]

عرف عام اور قیاس میں تعارض

عرف عام ایسے قیاس سے متصادم ہو جس کی علت نص سے ثابت ہو یا وضاحت کے اعتبار سے نص کے مشابہ ہو تو وہ معتبر نہیں ہے، رہے وہ احکام جو قیاس اجتہادی

عرفی، استحسان یا مصالح مرسلہ پر مبنی ہوں تو ان کے بجائے عرف عام کا اعتبار ہوگا۔[۶۵]

ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فان العرف العام یصلح مخصصاً..... ویترک به القیاس[۶۶]	عرف عام کے ذریعہ تخصیص کی جاسکتی ہے، نیز اس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑا جاسکتا ہے۔

بلکہ علامہ ابن ہمام تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

"نص کے موجود نہ ہونے کی صورت میں عرف اجماع کے درجہ میں ہے"[۶۷]

واقعہ یہ ہے کہ عرف کا دائرہ عمل، مسائل اجتہادیہ ہی ہیں، یہی وہ میدان ہے جہاں عرف مکمل طور پر اثر انداز ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسائل میں تبدیلی کی اکثر مثالیں اسی قسم کی ہیں، اور منشائے شریعت بھی یہی ہے کہ کچھ چیزوں میں اتنی لچک رہے کہ زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے تنگی و پریشانی نہ ہو، اس لیے ان کے بارے میں کوئی صریح حکم نہیں دیا گیا، اس کی وجہ سے فقہ اسلامی کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ تغیر پذیر قدروں کا ساتھ دے سکے، امام شاطبی فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے ایسے احکام نازل فرمائے ہیں جو ہر زمانے اور ہر جگہ کے مطابق حال ہیں، ان میں کچھ احکام تو وہ ہیں جن کے بارے میں نص صریح موجود ہے اور بعض عمومی قواعد کی حیثیت رکھتے ہیں کہ انھیں لوگوں کے حالات ماحول اور معاشرہ کے مطابق منطبق کیا جاسکتا ہے۔[۶۸]

عرف خاص اور قیاس میں تعارض

قیاس اجتہادی کے بالمقابل عرف خاص معتبر ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں قدرے اختلاف ہے، عام رجحان یہی ہے کہ عرف خاص کی وجہ سے قیاس اجتہادی کو ترک نہیں کیا جاسکتا ہے[۶۹] لیکن بعض مشائخ احناف مثلاً ابو علی نسفی، نصیر بن یحییٰ، محمد بن سلمہ وغیرہ کا خیال ہے کہ عرف خاص کی وجہ سے بھی قیاس اجتہادی میں تخصیص پیدا کی جاسکتی ہے، یا اسے چھوڑا جاسکتا ہے، اسی بنا پر ان حضرات کی رائے